مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ آپ سے ہر سٹے نہانے کو کون کہتا ہے ۔ ہاں تو یہ کہیے کہ نہ پڑھی جائے گی ۔

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ کپڑے تو چھیا بیا اور نماز پڑھ لوں ۔ ایسی نماز کے قربان ۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ ہاں تو یہ کہیے کہ نماز نہ پڑھیے گا اور پھر جب آپ ہی نہ پڑھیں تو لڑکے بھلا کیوں پڑھنے لگے ۔

غرضکہ اس تقریر کے بعد مرزا عابد حسین کی بیوی کو مایوسی ہو گئی ۔ مرزا فدا حسین کی بیوی کو جہاں اور شکایتیں تھیں ان سب میں سے ایک یہ بہت بڑی شکایت تھی ۔

ہائے اس جنگل میں لائے ڈالا ہے جہاں کہیں اذان کی آواز نہیں آتی ۔ ماتم کی آواز نہیں آتی ۔ جہاں شام ہوئی اور گیدڑ بولنے لگے ۔

جس دن سے نماز کے باب میں گفتگو ہوئی تھی ۔ اذان کا ذکر اس شکایت سے حذف کر دیا گیا تھا ۔ مگر ماتم کی شکایت باقی تھی بلکہ اس دن سے ماتم کے لفظ پر زیادہ زور دے دیا گیا تھا ۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ جب انسان کی ایک برائی ثابت ہو جاتی ہے تو وہ اپنی بعض نیکیوں کو جو اس میں موجود ہوں ظاہر کرنے کی زیادہ کوشش کرتا ہے تاکہ اس کی برائی کی وجہ سے جو اس کی ذلت ہوئی ہے دوسری نیکی اس کا موازنہ کر دے ۔

ماتم کے بار بار تذکرے سے یہ مقصود تھا کہ اگرچہ ہم نماز کے پابند نہیں ہیں لیکن ماتم داری کا شوق ہمیں بہ نسبت اور لوگوں کے کم از کم مرزا عابد حسین کی بیوی سے زیادہ ہے ۔ مرزا عابد حسین کے گھر میں اگرچہ ماتم اور نوحہ خوانی کا ذکر نہ تھا مگر خدا کے فضل سے چھوٹے سے لے کے بڑا تک سب ایک مذہبی تاریخ سے واقف تھے ۔ پیغمبرؐ اور اہلبیتؑ کے نام پر جان و دل سے فدا تھے ۔ ذکرِ اہلِ بیت

کو عبادت سمجھتے تھے۔ مگر نہ اس طرح کہ جیسا مرزا فدا حسین کی بیوی کا خیال تھا۔ آٹھویں دن جمعرات کو سوا پیسے کی ریوڑیاں منگوا کے کھڑے ہو جانا اور دو بول رسید سے الٹے کسی دھن میں پڑھ لینا اور ماتم حسین کہہ کے سینہ کوبی کر لینا ان کے نزدیک چنداں واجبات سے نہ تھا۔ مرزا عابد حسین کا طریقہ دینداری عام لوگوں کے ایسا نہ تھا اور ان میں ایک صفت خداداد تھی کہ جس بات کو اچھا سمجھ لیتے تھے اس کو عمل میں لانے سے پہلے ان کو کسی سے حجاب نہ ہوتا تھا۔ عوام کی تقلید محض سے ان کو چڑھ تھی۔ یہی طریقہ آپ کے گھر بھر کا ہو گیا تھا۔

چند روز تک مرزا فدا حسین کی بیوی کی ان شکایتوں کا کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ آخر ایمان کی بات تھی کہاں تک سکوت کیا جاتا۔ ایک دن مرزا عابد حسین کی بیوی کو کہنا پڑا۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ تو کیا تم جمعرات کو ماتم کیا کرتی ہو؟

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ ہاں بی بی سَو کام دنیا کے کرتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی کام ایمان کا بھی تو کرنا چاہیے۔ آخر خدا کو بھی ایک دن منہ دکھانا ہے۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ مگر آپ نماز تو پڑھتی نہیں جو اصل کام ایمان کا ہے۔

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ اچھا نماز نہیں پڑھتے نہ سہی۔ ماتم تو آٹھویں روز کا ناغہ نہیں ہونے پاتا۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ ایسے ماتم سے کوئی فائدہ نہیں۔ جب نماز نہ پڑھی تو خالی ماتم سے کیا ہوتا ہے؟

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ توبہ توبہ کرو۔ کفر نہ بکو۔ ماتم کو تم اس طرح کہتی ہو؟

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ میں سچ کہتی ہوں۔ امام حسینؑ اس بات سے ہرگز راضی نہ ہوں گے کہ خدا کے فرض کو آپ ترک کر کے ان کا ماتم کیجیے۔

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ یہ تم نے کیا کہا۔ ماتم ایک پر ایک ہے۔
مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ مگر نماز ہزار پر ایک ہے۔ بغیر نماز کے ماتم کام نہ آئے گا۔
مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ بھابی باہر رہتے رہتے تمہارا ایمان درست نہیں رہا۔
اور ہاں میں نے ایک اور بات سنی ہے۔ تمہارے میاں! اے ہے موئے وہ کون کہلاتے ہیں۔ ہاں خوب یاد آیا۔ نیچری۔ تمہارے میاں تو نیچری ہیں۔ جانتی ہوں کہ تم نے بھی میاں کے ساتھ اپنا ایمان کھو دیا۔
جب تو تم ماتم کو اس طرح کہتی ہو۔ تم ایسا نہ کہو۔ آل اولاد والی ہو۔
مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ کیوں اس میں آل اولاد کو خدانخواستہ کیا ضرر ہے؟
مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ لو اتنا بھی تم نہیں سمجھتیں۔ آل اولاد کا ذلل (ضرر) تو ہوتا ہی ہے۔ خدا کوئی لاٹھی لے کے مارتا ہے۔ جب اس کی باتوں میں تم پَے نکالتی ہو۔ اس کی سزا کچھ نہ کچھ ہونا چاہیے۔ یا دیدوں گھٹنوں کے آگے آئے یا خدانخواستہ شیطان کے کان بہرے اولاد کے دشمنوں پر بن آئے۔ ہر جمعرات کو ماتم کیا کرتی تھی۔ شامت کی مار تین جمعراتیں ناغہ ہوگئیں۔ بتو بی ایسی ماندی ہوگئی کہ کسی طرح بچنے کی کوئی توقع نہ تھی۔ آخر مجھے خواب میں دکھایا کہ تو ہمارا ماتم کیا کرتی تھی۔ اسے تو نے ناغہ کیا۔ آخر پائی نہ اس کی سزا۔
دوسرے دن سے میں نے تین وقت ماتم کرنا شروع کر دیا۔ صبح، دوپہر، شام، لیجیے اسی دن سے میری لڑکی اچھی ہونے لگی۔
مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ بھابی توبہ کرو۔ امام حسین کو بھی تم لوگوں نے اپنا سا بنا لیا کہ ذرا ذرا سی بات پر خفا ہو جاتے ہیں۔
مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ یہ تو خفا ہونے کی بات ہی ہے۔ آپس میں دیکھ لو۔ یہ

خیال کرد کہ تم مجھ کو عید بقرعید حصہ بھیجتی ہو اور جو نا غہ کرو تو مجھ کو رنج ہوگا یا نہیں۔ بس یوں ہی سمجھ لو۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ آپ تو مجھ کو کہتی ہیں مگر معلوم ہوا کہ آپ ایمان کی باتیں بالکل نہیں جانتیں۔

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ سچ ہے اپنی ہائی اوروں پر گنوائی۔ جیسے تم میاں کی محبت میں خدا اور رسولؐ سب بھول گئیں۔ ویسا سب کو جانتی ہو۔ بس تمہارے ایمان کا حال تو معلوم ہوگیا کہ شیعہ مومن ہو کے تم ماتم کی کوئی اصل نہیں سمجھتیں۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ میں ماتم کی کوئی اصل سمجھتی ہوں یا نہیں۔ یہ میرا دل جانے اور میرا ایمان۔ مگر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ مسلمان ہو کے خدا کی نماز جو واجبات سے ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتیں۔ نہ خود پڑھتی ہیں نہ بچوں کو سکھاتی ہیں۔ ہم لوگ امام حسینؑ کے غم کو اتنا مانتے ہیں کہ روز بعد نماز اور کلام اللہ کے سجادی کے ابا حدیث پڑھتے ہیں یا اگر وہ باہر ہوتے ہیں تو میں خود پڑھتی ہوں۔ سب چھوٹے بڑے گھر کے سنتے ہیں جو باتیں خوش ہونے کی ہیں ان پر خوش ہوتی ہوں اور جو رنج کرنے کی باتیں ہیں ان پر رنج کرتی ہوں۔ جن باتوں کو انھوں نے منع کیا ہے ان سے بچتے ہیں اور جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا ہے اسے حتی المقدور کرتے ہیں۔

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ ہم نے تو ایک دن بھی نہیں دیکھا۔

اس بات پر مرزا عابد حسین کی بیوی بے اختیار مسکرانے لگیں اور کہا۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ بھابی آپ کیوں کر دیکھتیں۔ آپ تو اس وقت سوتی

رہتی ہیں۔

"جو سویا اس نے کھویا"

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ (اس بات پر ذرا کھسیانی سی ہوگئیں) اے ہے تو ایک دن میں بھی سنوں گی۔ بھائی صاحب کیا پڑھتے ہیں۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ خیر وہ آج کل دورے پر ہیں۔ آپ سویرے اٹھیے میں آپ کو حدیث پڑھ کر سناؤں گی۔

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ ضرور کل ہی سہی۔

وعدہ تو کر لیا۔ مگر مرزا فدا حسین کی بیوی کو ایک دن بھی سویرے اٹھنا نصیب نہ ہوا کہ وہ حدیث سنتیں۔ مرزا فدا حسین کی بیوی میں ایک اور صفت تھی۔ بات بات میں گالی۔ خواہ ہنسی میں ہو۔ خواہ غصے میں۔ بچوں سے بات کرنے میں ہر ہر لفظ کے بعد ایک موٹی سی گالی ضرور شریک ہوگی۔ ہر مزی کی زبان بھی ماشاء اللہ خوب آراستہ تھی۔ چھوٹی لڑکی جو گود میں تھی اس کی زبان کھلنے لگی تھی۔ اس کو گالیاں تعلیم دی جاتی تھیں اور جو ایک آدھ لفظ اس معصوم بچے کی زبان سے نکل جاتا تھا تو اس سے بہت خوش ہوتی تھیں۔

صاحبزادے کا سن اب چودہ برس سے کچھ زائد تھا۔ جن کے سیل کے کونڈے کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔ ضلع۔ جگت پھبتی میں طاق تھے۔ ان کی شکایت سب سے بڑی یہ تھی کہ یہاں کنکوے کا کہیں ذکر نہ تھا اور بغیر کنکوا اڑائے آپ کیوں کر رہ سکتے تھے۔ آخر آپ نے یہ کارستانی کی کہ مرزا صاحب کے دفتر میں سے آپ نے ایک گڈی ٹریسنگ پیپر[1] کی اڑائی اور پیمائش کرنے

---

[1] ٹریسنگ پیپر ایک قسم کا باریک کاغذ ہوتا ہے جو عکس کشی کے کام آتا ہے۔

کرنے کی جھنڈیوں سے ایک جھنڈی کا بانس ان کی گوں کا تھا۔ اس کو کاٹ کے کانپ ٹھڈے چھیلے۔ کئی کنکوے تیار ہو گئے۔ ڈور کے لیے اماں کی بچکیں ستیا ناس کیں۔ خلاصہ یہ کہ انھوں نے اپنے شغل کے لیے اچھا خاصہ سامان تیار کر لیا۔ پڑھنے لکھنے سے کوئی غرض نہ تھی۔

ایک دن آپ کنکوا اڑا رہے تھے۔ اتفاق سے کنکوا ٹوٹ کے ایک غریب کسان کے کھیت میں جا گرا۔ اس کھیت میں گیہوں بوئے ہوئے تھے۔ آپ بے تکلف کھیت میں گھس گئے اور غریب کسان کی محنت کے سرسبز کھیت کو پامال کرتے ہوئے کنکوا اٹھا لائے۔ دو ایک مرتبہ تو کسان چپ ہو رہا لیکن جب کئی مرتبہ ایسا اتفاق ہوا تو اس نے انجینیر صاحب (مرزا عابد حسین) سے نالش کی۔ مرزا صاحب کو تعجب ہوا کہ یہاں کنکوا کہاں سے آیا غرضکہ وہ کنکوا منگا کے دیکھا گیا۔ کاغذ مرزا صاحب نے پہچانا۔ نہایت ہی جز بز ہوئے۔ اہلِ دفتر پر سخت تاکید کی یہ صاحبزادے دفتر نہ جانے پائیں۔ اور ٹریسنگ پیپر اپنے پاس سے منگا کے دفتر میں داخل کیا۔

صاحبزادے میں ایک اور عادتِ بد تھی۔ انجینیر صاحب کے بنگلے کے قریب ایک سرکاری باغ تھا۔ اس کی نگرانی مرزا صاحب کے ذمے تھی۔ اس کا ٹھیکہ سال کے سال دیا جاتا تھا۔ خود مرزا صاحب کے گھر میں میوہ اور ترکاری بازار سے آتی تھی۔ یا اگر بضرورت اس باغ سے لیا گیا تو اس کے دام ٹھیکہ دار کو دیے جاتے تھے۔ صاحبزادے نے اس باغ سے نارنگیاں اور امرود کچے پکے بے تکلف توڑنا اور کھانا شروع کر دیے۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ میاں ذاکر نے اس چرائے ہوئے مال سے چار پانچ

نارنگیاں اور امرود اپنی اماں جان کو بھی دیے۔ انھوں نے بھی بغیر اس تحقیق اور تفتیش کے کہ یہ کہاں سے لاتا ہے، نوش کرنا شروع کر دیں۔ آخر اس کی بھی شکایت شدہ شدہ انجینیر صاحب کے گوش گزار ہوئی۔ یہ چوری کا معاملہ تھا۔ مرزا صاحب نے ذاکر کو بلا کر سخت تنبیہہ کی۔ اور مزید تنبیہہ کے لحاظ سے یہ بھی کہہ دیا کہ اگر اب کی ایسا ہوا تو میں تم کو تھانے پر بھیج دوں گا۔ یہ خبر میاں ذاکر کی ماں تک پہنچی۔ اے لیجیے قیامت آگئی۔ گویا کسی نے بھڑ کے چھتے کو چھیڑ دیا۔ کوئی کوسنا اور گالی باقی نہ رکھی۔ کئی دن تک بڑبڑایا کیں۔ ہے ہے تھانے بھیجنے والا غارت ہو۔ اے لو بچے نے دو نارنگیاں باغ سے توڑ لیں۔ اس پر بچہ تھانے پر بھیجا جاتا ہے۔ یہ عزیز داری ہے۔ سچ ہے اس وقت کے عزیز نیز ید ہوتے ہیں۔

آخر یہاں تک کہ مرزا عابد حسین کی بیوی کو بولنا پڑا۔ دھڑا دھڑی کی لڑائی ہوئی۔

مرزا عابد حسین کی بیوی بیچاری لڑنا جانتی ہی نہ تھیں مگر آخر انسان تھیں کوئی فرشتہ تو تھیں نہیں۔ جھوٹی اور بے تکی باتوں پر خواہ مخواہ غصہ آ ہی جاتا ہے۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ بھابی آپ بھی قیامت کرتی ہیں۔ یہ تو کچھ ایسی برا ماننے کی بات نہ تھی جس پر آپ بے قصور برا بھلا کہہ رہی ہیں۔ لڑکے نے سرکاری باغ سے نارنگیاں اور امرود چرائے۔ اس پر اگر انھوں نے تنبیہہ کے لیے کچھ کہا تو کیا بیجا کیا۔

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ بس اسی بات پر تو میرے دل میں آگ لگتی ہے۔ جب تم چوری کا نام لیتی ہو۔ چوری کیسی۔ چچا کا باغ تھا

کے لڑکے نے دو پھل توڑ لیے تو اس میں کیا عیب ہو گیا۔ یوں روز وہیں سے پھل پھلاری آیا کرتی ہے۔ ماشاء اللہ گھر بھر کھاتا ہے تو کچھ نہیں۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ بس یہی تو آپ سمجھتی نہیں۔ ہمارے گھر میں جو کچھ آتا ہے مول آتا ہے۔

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ یہ تو ہم نے کہیں نہیں سنا۔ گھر کے باغ میں سے پھل پھلاری مول آتا ہے۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ تو کیا ہمارا باغ ہے ؟

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ پھر کس کا باغ ہے ؟

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ سرکاری باغ ہے۔

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ اچھا وہ سرکاری سہی۔ سرکار نے تو دیا ہے تر ترکاری کھانے کو۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ سرکار سے تنخواہ دی جاتی ہے۔ بھتہ دیا جاتا ہے۔ تر ترکاری کھانے کو باغ نہیں دیے جاتے۔ اور دیے جائیں تو کہاں کہاں دیے جائیں۔ آج یہاں کل وہاں۔ روز تو بدلی ہوتی رہتی ہے۔ باغ پر کیا موقوف۔ لاکھوں روپئے کی جائیداد، مال سرکاری، ان کے حوالے رہتی ہے۔ اس کی جو کچھ آمدنی آئی وہ سرکار میں دی جاتی ہے۔ مثلاً یہی باغ ہے۔ اس کا ٹھیکہ سال کے سال ہو جاتا ہے۔ ٹھیکہ دار جو روپیہ دیتا ہے وہ سرکار میں چلا جاتا ہے۔

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ ہاں آدھے تہائی کا ہو گا۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ توبہ کرو! ہم لوگ سوائے تنخواہ اور بھتے کے

ایک حبہ کے گناہگار نہیں ہوتے۔ جس طرح ہماری تنخواہ مہینے مہینے سرکار سے ملتی ہے، اسی طرح ہم سرکاری مال کا دام دام سرکار کو دیتے ہیں اس میں ہمارا کیا حق ہے جو ہم لے لیں۔

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ اچھا تو کیا پھل پھلاری سے بھی گئے گذرے؟

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ ہماری کیا حقیقت ہے۔ بڑے انجینیر صاحب جب دورے پر آتے ہیں ان کے لیے جو میوہ ترکاری جاتا ہے اس کے دام ان سے وصول کر لیے جاتے ہیں اور وہ خوشی سے دیدیتے ہیں۔

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ یہ تو سب کہنے کی باتیں ہیں۔ بچے نے دو نارنگیاں توڑ لیں اس پر طومار باندھا۔ ابھی بھائی صاحب یا میاں باقر دو امرود توڑ لیتے تو ان کا ہاتھ کون پکڑ لیتا۔ اچھا وہ سرکار ہی کا باغ ہے پھر کیا سرکار ہر وقت دیکھا کرتی ہے۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ بھابی پھر وہی کہے جاتی ہیں۔ یہ سچ ہے۔ کوئی ہاتھ نہ پکڑ لیتا اور نہ کوئی ہر وقت دیکھتا رہتا ہے۔ مگر خدا دیکھتا ہے۔ یہ تو کھلی کھلی چوری ہے۔ بھلا ان کے دشمن کیوں چوری کرتے۔ کیا خدا نے ہمیں پیسہ نہیں دیا ہے جو ہم مول لے لیتے۔

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ یہ تو ہم نے یہیں آ کے سنا۔ لکڑی کے چور کی گردن نہیں ماری جاتی۔ پھل پھلاری اس لیے ہوتا ہے جس کے ہاتھ لگا اس نے توڑ لیا۔ اے لو ہمارے میکے میں خالہ ہمسائی کے گھر میں بیری کا درخت تھا۔ ہم اور ہماری بہنیں لڑکیاں لڑکیاں تھیں۔ خالہ ہمسائی دن بھر جلایا کرتی تھیں اور ہم لوگ دن دن بھر بیر جھورا کرتے تھے۔ ایک دن انھوں نے مجھے اسی بات پر کوسا تھا۔ دوپہر کو وہ تو سو گئیں

میں نے مارے ڈھیلوں کے بیری کا ستھراؤ کر دیا۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ آپ نے بڑا اچھا کام کیا۔ مگر وہ خالہ ہمسائی کی بیری تھی۔ وہ چیخ پیٹ کے چپ ہو رہی ہوں گی اور یہاں پانچ کیریوں کے لیئے اگلے سال ایک شخص کو دو مہینے کی قید ہو گئی۔ یہ سرکاری مال ہے۔ اسے کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ اچھا بیوی۔ اب تو ہم تمہارے بس میں ہیں چاہے قید کراؤ۔ چاہے پھانسی دلواؤ۔ تم یہاں کی حاکم ہو۔ جو جی چاہے کرو۔ ہم تو خطادار بندے ہیں۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ اچھا تو بس۔ اب اس ذکر کو جانے دیجیے۔ آپ کا ملال بڑھتا جاتا ہے اور جو اصل بات ہے وہ آپ سمجھتی نہیں اور بے فائدہ طعنے دیتی ہیں۔

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ طعنے کہنے کی تو میری عادت نہیں، اور سمجھ کو جو تم نے کہا بے شک سمجھ تو میری الٹی ہے۔ سیدھی سمجھ تو آج کل کی چھوکریوں کی ہے اور ہزار بات کی ایک بات تو یہ ہے کہ سمجھ اسی کی ٹھیک ہوتی ہے جس کے پاس چار پیسے ہوتے ہیں۔ مفلسی میں آئی عقل جاتی رہتی ہے۔ اگر عقل ٹھیک ہوتی تو اس بڑھاپے میں اپنا شہر، گھر بار چھوڑ کے اس پردیس میں پرائے گھروں پر کیوں آ کے پڑتے اور لوگوں کی جوتیاں کیوں کھاتے۔

اس دل خراش تقریر کے ہر ہر لفظ نے بیچاری معصوم صفت مرزا عابد حسین کی بیوی کے دل پر نشتر کا کام کیا۔ مگر بیچاری نے صبر کیا اور کچھ جواب نہ دیا۔ مگر یہ قاعدہ ہے کہ جو لوگ کسی کا دل دکھانے کے لیے کچھ کہتے ہیں اور

جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے شخص پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوا تو انھیں اور غصہ آتا ہے۔ اس تقریر کے بعد مرزا فدا حسین کی بیوی منتظر تھیں کہ مرزا عابد حسین کی بیوی ضرور کچھ بولیں گی مگر وہ بیچاری لہو کے سے گھونٹ پی کے چپ ہو رہیں۔ اس پر مرزا فدا حسین کی بیوی کا غصہ اور بڑھا۔ اس موقع پر ایک اور ناشدنی واقعہ ہوا۔

مرزا عابد حسین کے ایک دوست نے ان کو کئی ٹوکرے امرود اور نارنگیوں کے اور اس کے ساتھ اور کئی قسم کا میوہ تھا۔ تحفے کے طور پر بھیجے تھے۔ مرزا صاحب نے محض اپنی سادہ دلی سے یا بطور تلافی مافات یا بطریق مہمان نوازی و دلجوئی وہ سب ٹوکرے بجنسہٖ مرزا فدا حسین کی بیوی کے پاس بھیج دیے۔ صورت واقعہ کی یہ ہوئی کہ جب یہ ٹوکرے میوے کے آئے۔ ذاکر مرزا صاحب کے پاس چپکا غریب بنا ہوا بیٹھا تھا۔ مرزا صاحب کے دل میں یہ خیال آیا کہ میں نے ذاکر کو جو اس دن تنبیہہ کی تھی ممکن ہے وہ کسی قدر ضرورت سے زیادہ ہو اس لیے کہ ذاکر کی ابھی اتنی عقل کہاں کہ وہ پرائیویٹ اور پبلک پراپرٹی (یعنی مال ذاتی اور مال سرکاری) کی حقیقت کو سمجھ سکے۔ ممکن ہے کہ اس نے میرا مال سمجھ کے میوہ توڑا ہو۔ اگرچہ اس دن کی چشم نمائی میری چنداں بیجا نہ تھی اور اس خیال کے ساتھ ہی ٹریننگ پیپر اور کنکوے بنانے کا واقعہ یاد آیا اور پھر اس کسان کی فریاد، مگر ان سب امور سے قطع نظر کر کے آخری تنبیہہ کی سختی پر مرزا صاحب نے اپنی کریم النفسی سے اپنی ذات کو ملزم فرض کر لیا۔ ان کو کیا معلوم تھا کہ گھر میں ذاکر کی والدہ غصے میں بھری بیٹھی ہیں۔

جس وقت مرزا صاحب نے یہ ٹوکرے ذاکر کو عنایت کیے۔ اسی وقت ایک مختصر سا لکچر بھی دیا جس سے ذاکر کی تشفی اور تسلی کما حقہٗ ہو گئی۔ مرزا صاحب

کے لکچر کا مضمون غالباً یہ ہوگا :۔

دیکھو بیٹا! اس دن جو ہم نے تم کو تنبیہہ کی تھی اس کا سبب یہ تھا کہ وہ باغ مال سرکاری ہے اور ہم اس کی حفاظت کے لیے مقرر ہیں اور اسی کی تنخواہ پاتے ہیں۔ یہ ہمیں ہرگز گوارا نہ ہوگا اور ضرور ہے کہ تم بھی اس کو پسند نہ کروگے کہ جو چیز تمہارے سپرد کی جائے اس میں سے خود صرف کر دیا کسی اور کو صرف کرنے دو۔ آج یہ ٹوکرے میوے کے ہمارے ایک دوست نے ہم کو بھیجے ہیں یہ سب ٹوکرے ہم تم کو دیے دیتے ہیں۔ اب یہ مال تمہارا ہوگیا۔ اس میں سے جس قدر جی چاہے خود کھاؤ یا کسی کو دو تم کو اختیار ہے۔

تسلی دینے والی تقریر اور پھر اس کے ساتھ میں ٹوکرے۔ ولایتی نارنگیوں اور بڑے امرودوں سے بھرے ہوئے ممکن نہ تھا کہ ذاکر کے دل میں کسی قسم کی آزردگی کا شائبہ بھی باقی رہتا۔

جب مرزا صاحب تقریر ختم کر چکے اور میاں ذاکر کو یقین ہوگیا کہ یہ سب کے سب ٹوکرے نارنگیوں اور امرودوں کے ان کا مال ہے پہلے تو یہ انداز کیا کہ ان کو کیونکر یہاں سے اٹھا لے جاؤں مگر یہ ان کی طاقت سے باہر تھا۔ پھر داہنے بائیں نظر کر کے دیکھا کہ کوئی ایسا آدمی ملے جو ان سب کو اٹھا کے میرے ساتھ لے چلے۔ اس وقت کوئی نظر نہ آیا۔ آخر ان کی عقل نے یہ فیصلہ کیا کہ ان میں سے تھوڑی نارنگیاں اور امرود ہاتھ میں اٹھا کے چلتے ہو۔ یہ خیال کر کے پھر یہ ٹوکرے تو کسی نہ کسی طرح گھر میں پہنچ ہی جائیں گے اور اگر پہنچے بھی تو وہاں جا کے حصہ رسدی بٹ جائیں گے۔ اس سے اپنا حصہ پہلے ہی کیوں نہ لے لو۔ انھوں نے سات آٹھ بڑی بڑی نارنگیاں اور چار پانچ امرود جیبوں میں بھر لیے اور کچھ ہاتھ میں لے کے گھر کی طرف روانہ ہوئے اور ایک نارنگی راستے

ہی میں پھیل ڈالی۔ جب یہ گھر کے اندر داخل ہوئے ہیں تو کئی پھانکیں اس کی نوش فرما چکے تھے۔ ان بیچارے کو کیا معلوم تھا کہ اماں جان غصہ میں بھری بیٹھی ہیں۔ جوں ہی یہ گھر میں گئے اور ان کی اماں نے امرود اور نارنگیاں ان کے ہاتھ میں دیکھیں۔ آگ بگولہ ہو گئیں اور ذاکر کو منہ ہی منہ خوب کچلا۔ وہ بیچارہ کہتا رہا کہ اے سنو تو۔ یہ مجھے چچا جان نے دیے ہیں۔ انھوں نے کچھ نہ سنا۔ برابر کچل رہی ہیں۔ آخر مرزا عابد حسین کی بیوی نے بڑی مشکلوں سے چھڑایا اور جس قدر نارنگیاں اور امرود ان کو ملے ان کو جوتیوں کے نیچے کچل کے مل ڈالا۔ اڑ جائیں یہ نارنگیاں۔ غارت ہوں یہ نارنگیاں۔ کھانے والا مرے۔ کھانے والے کو ہیضہ کھائے۔ مُوا کیسا بھکر بھکر کھا رہا تھا۔ ابھی اس دن جوتیاں کھا چکا ہے۔ بید کھا چکا۔ قید فرنگ بھگت چکا۔ مُوا بے غیرت۔ پھر وہی نارنگیاں۔ وہی امرود۔ ایسے کھانے سے مُوئی بری چیز کھائی ہوتی۔

میاں ذاکر جو پٹ پٹا کے علیحدہ کھڑے ہوئے تو وہ اپنی ہانک بول رہے ہیں۔

واہ مجھے تو چچا جان نے خود دی تھیں۔ مجھے تو انھوں نے تین ٹوکرے امرود اور نارنگیوں کے دیے ہیں۔ سب باہر رکھے ہیں۔

مرزا عابد حسین کی بیوی بچے سب ان کی خصلت سے واقف تھے کہ جب وہ کسی بچے پر خفا ہوتے ہیں تو ضرور ہے کہ وہ دوسرے وقت اس کی دل جوئی کریں۔ وہ اصل روداد کو سمجھ گئیں۔ لیکن ذاکر کی ماں کا غصہ کسی طرح فرو نہیں ہوتا۔ کوسنے پر کوسنے اور گالیاں پر گالیاں دیے چلی جاتی ہیں۔ منہ کھول دیا ہے اور آنکھیں اور دونوں کان بند کر لیے ہیں۔

نہ کچھ دیکھتی ہیں نہ کچھ سنتی ہیں۔ اپنی زٹل ہانک رہی ہیں۔ جب اس چیخ چاخ اور گالی گلوچ اور کوسم کاٹے کو بہت دیر ہو گئی تو آخر مرزا عابد حسین کی بیوی کو بولنا پڑا۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ بھابی آپ خواہ مخواہ چیخ رہی ہیں۔ صریحًا ذاکر کہے جاتا ہے کہ مجھ کو چچا جان نے نارنگیاں دی ہیں۔ اور آپ بے فائدہ اس پر بھی خفا ہوتی ہیں اور ہم لوگوں کو بھی جو جی میں آتا ہے کہہ رہی ہیں۔ خیر ہم لوگوں کو جو چاہے کہیے۔ ہم تو کچھ نہیں کہہ سکتے۔ آپ بڑی ہیں۔ مگر بچے کو تو بے گناہ نہ کوسیے۔

مرزا فدا حسین کی بیوی اس کی راہ دیکھ رہی تھیں کہ کچھ بولیں تو لڑائی کے سلسلے کو اچھی طرح طول دوں۔

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ بیوی ہٹو۔ تمہارا اس میں کیا دخل ہے۔ ہم اپنے بچوں کو نصیحت کرتے ہیں۔ تمہیں کیا۔ تم کون ؟

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ مگر قصور معاف کیجیے گا۔ یہ نصیحت تو بیجا ہے اس لیے کہ جب وہ کہے جاتا ہے کہ چچا نے مجھ کو تین ٹوکرے نارنگیوں اور امرودوں کے دیے ہیں تو اس نے قصور ہی کیا کیا ہے جس پر آپ نے بیکار اس کو مارا بھی اور اب کوس بھی رہی ہیں۔

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ بیوی ہٹو۔ انھوں نے لاکھ دی تھیں۔ اس نے کیوں لیں۔ اس دن کی گھڑکیاں بھول گیا۔ جیل خانے جانا بھول گیا۔ مُوا بے غیرت۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ یہ آپ بے کار کہتی ہیں۔ انھوں نے اس دن اپنا بچہ سمجھ کے تنبیہ کے لیے کچھ کہا تھا۔ اس پر اتنا برا مانا۔ آپ کو تو

اور خوش ہونا چاہیے کہ ہمارے بچے کو نصیحت کی۔ اور آج انھوں نے اس خیال سے کہ شاید اس دن کی تنبیہہ سے اس کو رنج ہوگا۔ کہیں سے میوے کے ٹوکرے آئے ہوں گے اس کو دے دیے۔ اس میں کون سی برائی کی؟

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ تم لوگوں کی وہ مثل ہے کہ سر پر جوتی اور منہ میں روٹی۔ اس دن تو ذلیل کر دیا اور آج نارنگیاں دینے بیٹھے ہیں۔ مولے بے غیرت تھا نا۔ اس نے خوشی خوشی لے لیں میں تو ایسی نارنگیوں کو آگ لگا دیتی۔ بھلے آدمی کو ایک بات اور بھلے گھوڑے کو ایک چابک۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ ابھی اس دن آپ ہی کہہ رہی تھیں کہ میرے دل میں بات نہیں رہتی مگر آج آپ کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ذرا ذرا سی بات میں گرہ باندھ رکھتی ہیں۔ اچھا بس اب جانے دیجے

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ تو میں تمہیں کچھ کہتی ہوں۔ مگر اس موئے کا تو جب تک ڈھائی چلو لہو نہ پی لوں گی مجھے چین نہ آئے گا۔ اس نے نارنگیاں کیوں لیں۔ جن نارنگیوں کے کارن اتنی ذلت اٹھائی۔ جوتیاں کھائیں۔ وہی نارنگیاں پھر کھانے لگا۔ موا کنگلا۔ بے غیرت یہ مُوا ہے ہی بے غیرت۔ یہ کیا اس کا باوا بھی بے غیرت ہے۔ جب تو موا بڑھاپے میں گھر بار چھوڑ کے پرائے ٹکڑوں پر آ کے پڑا ہوا ہے۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ افسوس میں لاکھ چاہتی ہوں کہ نہ بولوں۔ لیکن آپ باتیں اس طرح کی کرتی ہیں کہ بے بولے رہا نہیں جاتا۔ پرائے ٹکڑوں پر آ کے کیوں رُکے۔ نوکری میں کوئی عیب نہیں۔ ہم لوگوں کی مجال کیا ہے جو کسی کو ٹکڑے کھلائیں گے اور دنیا کا کارخانہ اسی طرح چلتا ہے ایک

کے حیلے سے ایک کا فائدہ ہوتا ہے۔ بھائی صاحب نے نوکری کے لیے کہا۔ یہاں ایک جگہ خالی تھی۔ انھوں نے نوکر رکھوا دیا۔ اس میں تو کوئی برائی نہیں ہوئی۔

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ ہوئی نوکری میں نوکری بھی ہو۔ پندرہ روپے کی نوکری اس کے لیے تمام عمر کا احسان ہو گیا۔ وہ اپنے عزیزوں ہی کا سہی احسان تو اٹھایا۔ عمر بھر کسی کے نمک کی کنکری کے شرمندہ نہیں ہوئے، اس بڑھاپے میں منہ کو کالک لگانا کیا فرض تھا۔ میں تو ان ہی کو کہتی ہوں تم کو کچھ نہیں کہتی۔ اس میں تمہارا برا ماننا بے کار ہے۔

مرزا عابد حسین کی بیوی نے دیکھا کہ ان کی عقل ٹھیک نہیں ہے۔ نہ یہ الٹی سمجھتی ہیں نہ سیدھی۔ ان سے حجت کرنا بے کار ہے۔ یہ وہاں سے اٹھنے کے لیے بہانہ ڈھونڈھ رہی ہیں۔ اتنے میں باقر نے آواز دی۔ اماں جان یہاں آئیے۔ یہ اٹھ گئیں۔ وہ نیک بخت ان کے اٹھ جانے کے بعد بھی بکتی رہیں اور ذاکر تو موقع پا کے کھسک گیا تھا ورنہ خوب ہی کوبہ کاری ہوتی۔

باقر مرزا عابد حسین کا بڑا لڑکا جو ابھی علی گڈھ کالج سے رمضان مبارک کی تعطیل میں آیا ہوا تھا۔ اس کے کان اس قسم کی باتوں سے نا آشنا تھے اس لیے کہ وہ اپنے اور اپنے وطنِ اصلی کے طرزِ معاشرت سے بالکل نا واقف تھا اور اس لیے کہ جب سے اس نے ہوش سنبھالا مرزا صاحب باہر رہے۔ گھر میں خدا کے فضل سے اس قسم کی گفتگو سنی نہ تھی۔ اس کی خصلتوں میں شائستگی پورا اثر کر چکی تھی۔ کالج کی تعلیم اور تربیت نے مغربی نظامِ اخلاق کا پہلا اصول۔ "جیو اور جینے دو" عملی طریقوں سے اس کے دل نشین کر دیا تھا اس طریقۂ تہذیب کا اسے ملکہ ہو گیا تھا جس میں یہ سکھایا

جاتا ہے کہ "دیانت بہترین مصلحت ہے" اس نے آنکھ کھول کر راست روی اور حق پسندی کی زندہ مثالیں یعنی اپنے والدین کو دیکھا۔ مدرسہ میں باہمی میل جول اور ہمدردی کے اکثر لکچر سنے۔ اپنے معلموں اور مدرسوں میں اکثر کو انسان کی بھلائی میں دل و جان سے کوشش کرتے ہوئے دیکھا۔ علم کی برکت سے حقوقِ والدین اور اس کے ساتھ ہی ان کے اعلیٰ درجے کے اخلاق کی عظمت اس کے دل میں سما گئی تھی۔ بغض و حسد، کفرانِ نعمت اور اس کے مثل گناہانِ کبیرہ یعنی وہ گناہ جو نظامِ معاشرت کو باطل اور کالعدم کرنے والے ہیں، اس سے اس کو ذاتی تنفر تھا۔ طعنے۔ تشنے، گالیاں، کوسنے، بکنا، بڑبڑانا، اور اسی قسم کی اور صفات سے وہ اجنبی تھا۔ اپنی ماں کے ساتھ ایک بے مغزی بدزبان اور بے تکی عورت کو الجھتے دیکھ کر اس کو انتہا درجہ کا طیش آیا۔ آخر اس نے اپنی ماں کو بلا کے اس واقعے کی اصلیت کو دریافت کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ سراسر قصور اسی عورت کا ہے اور والدہ اس معاملہ میں محض بے خطا ہیں جیسا کہ اس کو پہلے ہی یقین تھا۔ اس موقع پر باقر اور اس کی والدہ میں جو باتیں ہوئیں وہ لائقِ تحریر ہیں:۔

باقر:۔ میں نے اس سے پہلے کبھی اس قسم کی باتیں اپنے گھر میں نہیں سنیں۔ آپ کیوں بے کار اس کے ساتھ الجھتی ہیں۔ میں خیال کرتا ہوں کہ آپ کی صحت کو اس سے سخت ضرر پہنچے گا۔

ماں:۔ کیا کروں بیٹا۔ جب سے یہ آئی ہیں ناک میں دم کر دیا ہے۔ نہ سیدھی سمجھتی ہیں نہ الٹی۔

باقر:۔ میں تو ہرگز جائز نہ رکھتا کہ ایسے لوگ گھر میں رہیں بلکہ والد سے اس باب میں عرض کروں گا کہ ان کو فوراً گھر سے نکال دیں۔

ماں :۔ تمہارے ابا خود پریشان ہیں مگر عزیزداری کا واسطہ ہے۔ کچھ بنائے بن نہیں پڑتی۔

باقر :۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ ہماری ہمدردی کی قدر نہ کریں، ان سے کسی قسم کا نیک سلوک کرنا اپنی نیکی کو ضائع کرنا ہے۔

ماں :۔ ہاں یہ سچ ہے مگر کیا کیا جائے۔ آخر ہمیں تو نیکی ہی کرنا چاہیے۔ اب اس پردیس میں ان کو کہاں نکال دیں ؟

باقر :۔ اماں جان میں اس دل کی نیکی کا اندازہ نہیں کر سکتا جس میں ایسی باتیں بھری ہوئی ہیں۔ جو آپ کے منہ سے نکلتی ہیں مگر میں نہایت ادب کے ساتھ آپ سے اختلاف کرتا ہوں کسی شخص کے حقوق سے زیادہ اس کی رعایت کرنا میرے نزدیک ایک طرح کی ناانصافی ہے۔ آپ میری رائے سے اتفاق کریں گی۔ مجھے ایک دن کے لیے ان کا گھر میں رہنا مناسب نہیں معلوم ہوتا اور اگر کسی مصلحت سے جس کو آپ سمجھتی ہوں، یا ابا جان، ان کا گھر میں رہنا ضروری سمجھیں تو ضرور ہے کہ میرے علیحدہ رہنے کا بندوبست کر دیا جائے۔ اگرچہ ان بیہودگیوں کا اثر آپ پر نہ پڑ سکے گا مگر خاندان کے لوگوں پر جو ابھی کمسن اور ناتجربہ کار ہیں اس کا بہت برا اثر پڑے گا۔

مرزا عابد حسین کی بیوی بات کے پہلو کو سمجھ گئیں۔ باقر حسین بہت دور کی بات کہتا ہے اور اس کی تقریر کا صاف منشا ہے کہ اگر یہ گھر میں رہیں گی تو میں ہرگز نہیں رہوں گا اور اپنے بیوی بچوں سمیت علیحدہ ہو جاؤں گا۔

باقر :۔ مجھے اس وجہ سے بھی ان کے ساتھ رہنا منظور نہیں کہ چار پانچ دن کا ذکر ہے کہ نادر کو یہ گود میں کھلا رہی تھیں، ایک بیہودہ بات زبان سے

نکالی جس کو سن کے میری آنکھیں نیچی ہو گئیں اور ان کو کسی قسم کی غیرت نہ آئی۔ بچے جو باتیں بار بار کانوں سے سنتے ہیں اسی کو دہرانے لگتے ہیں۔ میں ہرگز گوارا نہ کروں گا کہ نادر کی زبان گالیوں پر کھلے۔

ماں :۔ ہاں مجھے یاد آیا۔ یہ ان لوگوں کی پیار کی باتیں ہیں۔

باقر :۔ میں باز آیا ایسے پیار سے۔ میں تو یہ خیال کرتا ہوں کہ ان لوگوں کو گالیاں دینے اور گالیاں سننے کی عادت ہو گئی ہے۔ یہ لوگ بغیر اس کے رہ نہیں سکتے۔ کوئی نہیں ہے تو معصوم بچے کو گالیاں دے رہے ہیں۔ آخر اس کا انجام یہ ہو گا کہ جب بچہ کی زبان کھلے گی تو وہ بھی گالیاں بکنے لگے گا میرے کسی مہذب دوست کی گود میں اگر میرے لڑکے نے کوئی گالی زبان سے نکالی تو مجھے نہایت ہی حجاب ہو گا۔

باقر کے وجوہات ایسے معقول اور مدلل تھے کہ ماں کو سوائے اس کے کہ مقدمہ کو مرزا عابد حسین صاحب کے فیصلے پر محمول کریں کچھ کہتے نہ بن پڑا۔

شب کو جب مرزا صاحب کھانا کھانے کے لیے گھر میں تشریف لائے تو کل واقعات من وعن ان سے بیان ہوئے۔ باقر کی رائے کو مرزا صاحب نے بہت پسند کیا۔ دوسرے دن مرزا فدا حسین کو نوکری پر سے بلوا بھیجا۔ نشیب و فراز سمجھا کے اس امر پر آمادہ کیا کہ وہ اپنے بیوی بچوں کو اس جگہ جہاں وہ متعین تھے لے جائیں۔

مرزا فدا حسین کا جس جگہ تعین ہوا تھا وہ ہیڈ کوارٹر سے پچیس ۲۵ میل کے فاصلے پر تھا۔ اس جگہ پر ایک ڈاک بنگلہ تھا۔ اسی کے شاگرد پیشہ کے متصل ایک چھوٹا سا سائبان محرر کے رہنے کے لیے بنا ہوا تھا۔ مکان سے ملی ہوئی چوکی دار کی کوٹھری تھی۔ تھوڑی دور کے فاصلے سے ایک بارک مزدوروں کے

رہنے کے لیے بنی ہوئی تھی۔

انجینیر صاحب نے مزید عنایت سے پچاس روپئے کی منظوری محرر کے مکان کی مرمت اور ضروری تبدیلیوں کے لیے کرکے تحویل سرکاری سے وہ روپیہ مرزا فدا حسین کو دلوایا۔

یہ ایک خاص قسم کی اعانت تھی جو مرزا صاحب نے اپنی نوکری کے زمانے میں بہت کم کی ہوگی۔ مرزا صاحب یہ روپیہ اپنے پاس سے ادا کرتے پر بڑی خوشی سے راضی ہوجاتے مگر سرکاری مکان تھا۔ اس میں کسی قسم کے ذاتی مصارف کے یہ مجاز نہ تھے۔

خلاصۂ تقریر یہ ہے کہ مرزا فدا حسین بی بیوی، لڑکی اور لڑکا (یعنی میاں ذاکر) اس واقعے کے تیسرے چوتھے روز انجینیر صاحب کے بنگلے سے رخصت ہوکے ایک بیل گاڑی میں سوار ہوکے روانہ ہوئے۔

جس دن جانے کی تیاری ہورہی تھی، اس دن مرزا فدا حسین کی بیوی نے صبح سے بکنا اور بڑبڑانا شروع کیا۔

۱۔ آخر میاں سے کہہ کے نکلوا دیا نا۔ اب دیکھیے کس جنگلے میں جاکے رہنا پڑتا ہے۔ شیر کھاتا ہے یا بھیڑیے کھاتے ہیں۔ اس بڑھاپے میں دیکھیے کیا لکھا پورا ہوتا ہے۔

۲۔ اے ہے لوگو۔ کیا بری عادت ہے۔ ذرا سی بات ہوئی اور پھُس سے میاں کے کان میں پھونک دی۔ جب آدمی ایک جگہ رہتا سہتا ہے تو لڑائی بھڑائی بھی ہوتی ہے۔ ایسی باتیں کوئی مَردوں کے منہ پر رکھتا ہے نکلوا دیا تو کیا ہوا؟ ہمیں پڑ رہنے بھر کو جگہ نہ ملے گی؟ آدمی اتنا بھی نہ اترائے۔ غرور خدا کو بھی پسند نہیں۔ کیا ہم مکان سر پر اٹھالے جاتے اور مکان بھی مُوا مفت کا۔